جناب ابوسلمان شاہجہان پوری

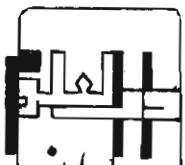

دارالعلوم دیوبند کے صد سالہ جشن کی مناسبت سے

یادگارِ عظمتِ اسلاف

دارالعلوم دیوبند کا نام زبان پر آتا ہے تو تصور صرف ایک دینی مدرسے کے دائرے میں محدود نہیں رہتا۔ دارالعلوم معقول و منقول کی رسمی و روایتی درس گاہ نہیں بلکہ وہ بہت سے تعلیمی، ثقافتی، علمی، سیاسی اداروں اور تحریکوں کا جامع ہے۔ یہ ہندوستان کی سرزمین میں وہ شجرِ طیبہ ہے جسکی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں چھپی ہوتی ہیں، اسکی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیلی ہوتی ہیں، اس کے سائے میں راستہ چلنے والے سکون و طمانیت حاصل کرتے ہیں اور اس کے شیریں پھلوں سے اپنے کام و دہن کو لذت بخشتے ہیں اور اس کے ظاہری مناظر اور اسکی شگفتگی و شادابی دیکھنے والوں کو سرور بخشتی ہے۔ نادان اس کے سائے میں آرام کرتے ہیں، اس کے پھلوں سے لذت حاصل کرتے ہیں، پھر اسکی شاخوں کو توڑتے ہیں، پتوں کو برباد کرتے ہیں۔ اسکی جڑوں کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اس کے تنے پر کلہاڑیاں چلاتے ہیں، اس کی شگفتگی اور تر و تازگی کو برباد کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے، لیکن اسکی فیض رسانی اللہ کے حکم سے تھی جو کبھی بند نہ ہوئی اور اس کا قیام و وجود مشیتِ ایزدی اور منشائے خداوندی کے مطابق تھا۔ اس لئے اس پر کبھی حرف نہ آیا۔ اسکی زندگی کے خمیر میں صبر و قناعت شامل تھی اس لئے اس نے نہ کبھی غیروں کی شکایت سے زبان کو آلودہ کیا نہ اپنوں سے ان کی سربلندی میں اپنے حصے کا صلا مانگا۔ گزشتہ ایک سو سال سے زیادہ مدت سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ میں وہ اپنا سر اونچا کئے ارجمندی اور عظمتِ اسلاف کی علامت کے طور پر کھڑا ہے۔ اس مدت میں انکار و حوادث کے کتنے ہی طوفان اس کے سر و شانے سے ٹکرا کر اور اس کے جیب و گریبان سے کھیل کر گزر گئے۔ نادان سمجھتے تھے کہ عظمتِ اسلاف کی یہ یادگار ان حوادث میں اپنا وجود قائم نہ رکھ سکے گی لیکن طوفان اور حوادث کے ہر تھپیڑے کے بعد اسکی شخصیت نکھرتی اور وجود سربلند ہوتا رہا۔ ۱۹۴۷ء کے حادثات کے بعد بھی اگر ایشیا میں ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور ملی و ملکی خدمات کا کوئی سب سے گہرا نمایاں اور روشن نقش نظر آتا ہے تو وہ صرف دارالعلوم دیوبند ہے۔ دارالعلوم تاریخ کا ایک جلی عنوان اور روشن باب ہی نہیں بلکہ برصغیر کے مسلمانوں

کی ایک جامع و مکمل دینی، تعلیمی، تہذیبی، سیاسی، ملی، تاریخ کا نام ہے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا جائے تو برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ ثقافت و سیاست کا تمام قابلِ فخر سرمایہ نظروں سے چھپ جاتا ہے اور دینی خدمات نہ ہونے کے برابر اور ملک کی آزادی ملّتِ اسلامیہ کی سربلندی، اسلامی علوم و فنون اور ثقافت کے تحفظ کی جد وجہد اور عزیمت دعوت کی تاریخ میں سرسیّد کی گداگری، مرزا غلام احمد کی منت گزاریوں اور جاگیرداروں کی ملّت فروشیوں اور غداریوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

دارالعلوم دیوبند ایک سرچشمہ تھا جسکی فیض رسانیوں اور نفع بخشیوں نے ملّت کے نخلِ امید کو سرسبز و شاداب کر دیا۔ اور زندگی کے ہر گوشے میں علم و عمل کے ہر میدان میں ملّتِ اسلامیہ کے دماغوں کو افکارِ حقّہ اور دلوں کو امنگوں اور ولولوں سے معمور کر دیا۔ اس نے مسلمانوں کے سامنے زندگی کے ہر گوشے میں راہِ عمل کھولی اور اپنے اخلاق اور سیرت کی روشنی سے راہوں کو منوّر کر دیا۔ مسلمان چاہیں تو وہ نئے حالات میں یمین و یسار کے تذبذب کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر سکتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں

مقصدِ قیام دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو روشن اور تابناک۔ اس نے علومِ دینیہ کی تعلیم و اشاعت میں جو کارنامہ انجام دیا اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ہندوستان پاکستان اور اب اس میں بنگلہ دیش کا نام بھی شامل کر لیجئے کوئی دور دراز گوشہ ایسا نہیں ہو سکتا جہاں مسلمان ہوں اور عقائد و اخلاق و سیرتِ اسلامی میں دیوبند کے اکابر اور فیض یافتگان کے دستِ تعلیم و تربیت کا اثر موجود نہ ہو۔ دنیا کی نظروں میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کا خاص مقصد علومِ دینیہ کی اشاعت و تعلیم تھا۔ اور اگر صرف یہی مقصد تھا، تب بھی مسلمانوں کی علمی و عملی زندگی کا کون سا گوشہ ذہنی و فکری تربیت کا کون سا اصول، اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا کون سا کام، اخلاق و سیرت کی تعمیر کی کون سی ضرورت، دین و دنیا کی بھلائی کا کون سا میدان اور فلاحِ فرد و ملّت کے نصب العین کا کون سا پہلو تھا جو اس میں نہیں آگیا۔

اور اگر کسی کو اصرار ہو کہ اسکی خدمات کے ہر پہلو پر وقت کے اصول تالیف و تصنیف کے مطابق الگ الگ بحث کی جائے تو اس صحبت میں بھی گنجائش و فرصت کے مطابق اسکی خصوصیات کے مختلف پہلوؤں کی طرف ضروری اشارات ضرور کئے جا سکتے ہیں۔

مدارس کے قیام کی ہمہ گیر تحریک دارالعلوم دیوبند ملّت کے چند بہی خواہوں نے جن مقاصد کے لئے قائم کیا تھا وہ مقاصد سہارنپور کے ایک گم نام قریے میں صرف ایک مدرسہ قائم کر دینے سے پورے نہیں ہو سکتے تھے، ضرورت تھی کہ اس جذبے کو عام کیا جائے اور مدارسِ دینی کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا دیا جائے۔ چنانچہ بانیانِ دیوبند نے ایک ایسا دینی تعلیمی جذبہ پیدا کیا کہ اسی زمانے میں ملک کے طول و عرض میں کئی مدرسے قائم ہوئے۔

۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں "مدرسہ قاسمیہ مرادآباد" کا قیام عمل میں آیا جو اب عام طور پر "مدرسہ شاہی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بنیاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اس کے چند سال بعد حضرت قاسم العلوم ہی کے ایما و تحریک پر "جامعہ اسلامیہ عربیہ" کے نام سے امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ نگینہ (یوپی) میں ۱۲۹۲ھ سے ایک مکتب قائم تھا۔ حضرت حجۃ الاسلام کے مشورے سے اسے ترقی دے کر علوم اسلامی کی ایک قابل فخر درس گاہ بنا دیا گیا اور حضرت ہی کے نام پر اس کا نام "مدرسہ قاسمیہ عربیہ" رکھا گیا۔ "مظاہر العلوم سہارن پور" کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کے آغاز و بنا میں بھی بانیان دیوبند کے احباب و خلف کا حصہ تھا اور دارالعلوم دیوبند ہی کے مقاصد تعلیم و تربیت کے لئے اس کا وجود عمل میں آیا تھا۔ بانیان دارالعلوم دیوبند کے احباب اور شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا عبدالحی و شاہ اسماعیل شہید رحم اللہ کے تلامذہ میں سے مولانا سعادت علی جون پوری نے جون پور میں گذشتہ صدی کے اواخر میں مدرسہ قرآنیہ قائم کیا۔

مدارس کے قیام کا یہ سلسلہ دارالعلوم دیوبند کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ اور ملک کے طول و عرض میں متعدد مدارس قائم ہو چکے تھے۔ لیکن یہ چمن بندی کا آغاز تھا۔ فصل گل کا موسم ابھی دور تھا۔ اس موسم کا آغاز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ علیہ الرحمۃ کے عہد سعادت سے ہوتا ہے۔ آپ کے زمانے میں اور آپ کے تلامذہ کی کوششوں سے برصغیر پاک و ہند کا چپہ چپہ علوم دینی کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھا اور ملی تحریکات اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ آپ کی مساعی مشکور سے ملت کے مضمحل و منتشر قوی میں ایک نئی قوت اور اعضاء و جوارح میں ایک نظم پیدا ہو گیا اور دارالعلوم کا فیضان عام ہو گیا۔

۱۸۹۵ء میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے خلیفہ و مجاہد ملت حافظ محمد صالح مولانا فضل احمد، منشی رحمت اللہ اور دیگر حضرات نے "مدرسہ رشیدیہ" کے نام سے رائے پور ضلع جالندھر میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۷ء میں "مدرسہ نعمانیہ" کے نام سے امرتسر میں اسی سلسلے کے وابستگان نے ایک دینی درس گاہ قائم کی۔

دہلی کی مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ امینیہ" حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا امین الدین نے قائم کی۔ اور دوسرے نامور شاگرد حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہان پوری ثم دہلوی کے اخلاص و ایثار نے اسے ایشیا کی چند مشہور دینی جامعات کی صف میں شامل کر دیا۔ سندھ میں حضرت شیخ الہندؒ کے نامور شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے بمقام گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدرآباد) "دارالرشاد" کے نام سے ۱۹۰۹ء میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ پھر ۱۹۱۲ء میں اسی نام سے نواب شاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس سے پہلے ۱۸۸۴ء میں مولوی عبداللہ مرحوم نے ایک مدرسہ کراچی کے محلہ کھڈہ میں قائم کیا تھا۔ مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا محمد صادق حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کے ارشد تلامذہ میں سے ایک تھے، جنہوں نے سندھ میں علوم اسلامی کی ترویج و

اشاعت تبلیغ اسلام رد بدعات و محدثات اور تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد صادق کی مساعی حسنہ کا مرکز ان کے والد کا قائم کردہ مدرسہ تھا جو تاریخ میں "مدرسہ مظہر العلوم" کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور میں حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوری نے جو علوم قرآنی میں اپنے تبحر کی بناء پر شیخ التفسیر کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۴ء میں "مدرسہ قاسم العلوم" کے نام سے علوم دینی کی ایک درس گاہ کا آغاز کیا۔ ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں ڈھابیل (سورت) میں "جامعہ اسلامیہ" کے نام سے مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا جس نے بہت تھوڑی مدت میں دینی و تعلیمی حلقوں میں اعتماد پیدا کر لیا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ کی صف میں ہر دو حضرات کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں چند مخلصین ملت نے جو اس سے پہلے "انجمن اصلاح" قائم کر چکے تھے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جس کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندیؒ کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں گجرات کے ضلع کھیڑ میں آنند کے مقام پر حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے ہاتھوں "جامعہ عربیہ تعلیم الاسلام" کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد پڑی جس نے گجرات کے علاقے میں علوم دینی کی اشاعت اور تبلیغ اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۱ء میں حضرت شیخ الہندؒ کے مشورے سے مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے دہلی میں "مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جس میں دو تین استاد درس قرآن و حدیث کی خدمت میں مصروف تھے اور ایک خاص جماعت جو دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے فارغین پر مشتمل تھی، مولانا سندھی مرحوم کے زیر تعلیم و تربیت تھی۔ لیکن انگریزی حکومت اس چھوٹے سے ادارے سے جس طرح لرزہ براندام تھی۔ اس کا کچھ اندازہ تحریک شیخ الہندؒ کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں مدرسہ دینیہ اسلامیہ غازی پور ملت کے چند بہی خواہوں اور علوم اسلامی کی ترویج کے شائقین کے ہاتھوں قائم ہوا، لیکن اس کا نظام تعلیم و تدریس دارالعلوم سے مستعار اور زمام تعلیم و تدریس شروع سے اب تک فاضلین دیوبند کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ غازی پور کا مشہور اور تاریخی مدرسہ "چشمۂ رحمت" ۱۸۶۹ء میں قائم ہوا۔ اگرچہ اس کے بانیوں کا پہلا تعلق علمائے فرنگی محل سے تھا، لیکن آغاز کے بعد مدرسہ ہر دور میں فرزندان دارالعلوم دیوبند کی مساعی اور خدمات کا منت گزار رہا ہے۔ جون پور کے قصبہ صبر حد کی مثالی درس گاہ "مدرسۂ فاروقیہ" کی تعلیمی و اصلاحی روح وہی ہے جو دارالعلوم دیوبند کے نظام تعلیم و تربیت میں رواں ہے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف "مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ" کا قیام ۱۹۱۲ء اور اسکی ترقی دارالعلوم دیوبند کے چشمۂ علم و عرفان سے سیراب ہونے والوں کی رہین منت ہے۔ اس سلسلے میں "جامعہ ملیہ نواکھالی" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اسے دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ سمجھنا چاہئے۔ یہ اگرچہ ایک مستقل بالذات ادارہ ہے لیکن اس کے امتحانات اور کارگزاری

کی نگرانی دارالعلوم کی طرف سے ہوتی ہے۔

یہ عہدِ سعادت تو حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے تلامذہ کا دور تھا۔ یہ تحریک اس دور کے بعد ختم نہیں ہوگئی بلکہ گزشتہ ۲۵، ۳۰ سال کے عرصے میں پاکستان کے مختلف شہروں میں چند ایسے دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے جن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہوسکتا۔ ان مدارس میں جامعہ اشرفیہ لاہور (۱۹۴۷ء) جامعہ رشیدیہ ساہی وال (۱۹۴۷ء) دارالعلوم خیرالمدارس ملتان (۱۹۴۷ء) دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (۱۹۴۷ء) دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈوالہیار (حیدرآباد) (۱۹۴۹ء) دارالعلوم کراچی (۱۹۵۰ء) جامعہ اشرفیہ پشاور (۱۹۵۳ء) جامعہ مدنیہ لاہور (۱۹۵۵ء)، مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی (۱۹۵۵ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس سلسلۃ الذہب کی یہ آخری کڑیاں نہیں ہیں۔ ان مدارس کے بعد بھی بے شمار مدارس پاکستان کے طول وعرض اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کے دور و نزدیک کے علاقوں میں قائم ہوئے ہیں۔

یہ تمام ادارے برصغیر میں علومِ اسلامی کی تعلیم وتدریس، اسلامی شعائر اور تہذیب وثقافت کے تحفظ، ملک کی آزادی کی جدوجہد اور ملی تحریکات اور اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ تمام مدارس اپنا اپنا جداگانہ اور مستقل نظام اور حلقہ اثر رکھتے تھے لیکن ہندوستان وپاکستان میں اسلامی تعلیم و تربیت کے نظامِ تعقل میں دارالعلوم دیوبند اور ان اداروں کا تعلق وہی تھا جو نظامِ فلکی میں سورج اور دوسرے سیاروں کا ہوتا ہے۔

ان سطروں سے دارالعلوم کے دائرہ فیضان کا جو تصور ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ حقیقت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی کام ہی نہیں کیا گیا۔ اور کوئی سنجیدہ کوشش ایسی نہیں کی گئی ہے۔ جس سے دارالعلوم دیوبند کے افادہ وفیضان کا واقعی اندازہ ہوسکے۔

یہ تو دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کے چند خاص مدرسے تھے۔ لیکن اگر صوبہ یا علاقہ وار جائزہ لیا جائے تو صرف ایک مضمون اس مواد کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہوگی۔ ہندوستان پاکستان کا کونسا گوشہ ایسا ہے جہاں دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کا چھوٹا یا بڑا مدرسہ قائم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اہم مدارس کی ایک مختصر سی فہرست غلام رسول نے مرتب کی ہے، دوسری فہرست جو بہار واڑیسہ کے اہم مدارس کی ہے — پروفیسر عبدالمنان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ گجرات کے باکمال اور برگزیدہ علمائے کرام کی دینی خدمات کا ایک مختصر جائزہ حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ نے لیا ہے۔ اس طرح مالابار میں دینی تعلیم کی مرکزی درس گاہوں کے بارے میں محمد اسلم نے معلومات فراہم کی ہیں۔ (ان مضامین کے لئے دیکھئے البلاغ بمبئی تعلیمی نمبر) مغربی پاکستان کے عربی مدارس کا ایک مفصل جائزہ حافظ نذر احمد نے مرتب کیا۔ علم وآگہی کراچی کے دو ضخیم نمبروں (برصغیر پاک وہند کے

علمی و ادبی اور تعلیمی ادارے جلد اوّل دوم) میں دیوبندی مکتبہ فکر کے بہت سے تعلیمی اور علمی ادبی اداروں اور انجمنوں کے حالات سمیٹ لئے گئے ہیں اس سلسلے میں برگ گل کراچی کا تعلیمی پالیسی نمبر بھی قابل توجہ ہے۔ ان کتب و رسائل میں مدارس کی تاریخ اور اس کے بانیوں کے حالات کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی فیض رسانیوں اور اس کے اکابر و اصاغر کی نفع بخشیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے اثرات | قدیم و جدید کی تفریق ہندوستان پاکستان میں مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ دیوبند کو قدامت کا پرستار اور علی گڑھ کو جدت کا والہ و شیدا بتایا گیا ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی مختلف دردمندان قوم نے کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ الزام جدت کے پرستاروں کی طرف سے اور قدیم و جدید کے مابین خلیج کو پاٹنے کی تمام تر کوششیں قدامت پرستوں کیطرف سے عمل میں آئی ہیں۔ ندوۃ العلماء اس کی مثال ہے جس کے معرکوں اور بانیوں میں دیوبند کے سلسلے کے بزرگ و اکابر نمایاں ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین خلیج کو پاٹنے کی نہایت مخلصانہ کوششیں کیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لئے خصوصی نصاب کا بندوبست کیا، دارالعلوم دیوبند کے فارغین کی علی گڑھ جانے اور جدید علوم سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی قائم ہوا تو اس کے سرپرستوں میں حکیم اجمل خان مرحوم کے ساتھ نواب وقار الملک کو برابر کا شریک بنایا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بیماری کی انتہائی شدت کے باوجود علی گڑھ کا سفر کیا اپنے وصال سے چند دن قبل جامعہ ملیہ دہلی کا سنگ بنیاد رکھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ علی گڑھ کے قلب کی سیاہی ایمان کی روشنی میں بدل جائے لیکن ان مخلصانہ مساعی کے صلے اور جواب میں علی گڑھ کے فرزندوں نے حضرت شیخ الہندؒ، آپ کے ساتھیوں، شاگردوں، جان نثاروں، مولانا سندھی وغیرہ کی جاسوسی کی ان کے لئے مشکلات پیدا کیں قید و بند کے دروازے کھولے۔ گورنمنٹ میں عہدے اور منصب اور سرٹیفکیٹ حاصل کئے اور اس طرح دارالعلوم کے اکابر اور مخلصین ملت کی ایک ایک کوشش کو ناکام بنا دینے کی کوشش کی دیوبند اور علی گڑھ کی یہ کشمکش تھی جس نے بعد میں مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند کی چپقلش کی صورت اختیار کی۔ انتہائی تلخ تجربات کے باوجود اس دور میں بھی علمائے دیوبند مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق اور قدیم و جدید کی ہم آہنگی سے مایوس نہیں ہوئے لیکن مسلم لیگ کے اکابر نے انہیں جس طرح مایوس کیا اس کی دردناک روداد مولانا شبیر احمد عثمانی نے علیہ الرحمہ نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کر دی ہے۔ یہ انٹرویو خواجہ عبدالوحید صاحب نے لیا تھا اور علامہ عثمانی کی زندگی ہی میں لاہور کے ایک اخبار میں چھپوا دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ علی گڑھ دیوبند کو کبھی گوارا نہیں کر سکا لیکن ملت کی غمگساری اور اسلامی اخلاق و سیرت اور اخلاص و عمل میں دیوبند سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہا۔

علی گڑھ کے جامد اور انگریز پرست ماحول سے جو چند آزادی کے متوالے اور ملت کے بہی خواہ نکلے جنہوں

نے علی گڑھ کی پیشانی کے کلنگ کا ٹیکا مٹانے کی کوشش کی اور اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے لیکن وہ اپنے اخلاص اور بہی خواہی ملت کا نقش ضرور لوگوں کے دلوں پر ثبت کر گئے۔ ان میں مولانا محمد علی، شوکت علی، تصدق احمد خاں شیروانی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خان، مولانا حمید الدین فراہی، اور چند ایسے ہی اور حضرات ہیں۔ یہ تمام اصحاب حضرت شیخ الہندؒ سے متاثر اور آپ کے نقش سیرت کے گرویدہ تھے اور اسی تاثر اور گرویدگی کے نتیجے میں قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا تھا۔ علی گڑھ میں سرسیّد کی گدایانہ پالیسی کے خلاف جو احساس اور جذبہ پیدا ہوا اس میں سب سے نمایاں اثر دیوبند کا تھا حالانکہ دیوبند کے اکابر نے علی گڑھ کے خلاف نہ تو کبھی پرجوش تقریریں کی تھیں نہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تھا۔ اور نہ محمد علی کیطرح اسکی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن دیوبند کی ایک سیرت تھی جس نے علی گڑھ کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ یہ سیرت اپنا کام کر رہی تھی۔ اور اس کے اثرات رفتہ رفتہ پھیل رہے تھے۔ علی گڑھ کے علاوہ ملک میں دوسرے سیاسی و دینی ادارہ ثقافتی و تہذیبی حلقے بھی دیوبند سے متاثر ہوئے۔ نواب وقار الملک ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی پیداوار نہ تھے۔ حکیم اجمل خان ایک دوسرے دائرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) کا میدان دوسرا تھا، مولانا ابوالکلام آزاد کا ابتدائی ماحول دوسرا تھا، ان کے والد ایک دوسرے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ حالی و شبلی اپنی الگ الگ دنیائیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کا مزاج اپنا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت اور دارالعلوم دیوبند کے نقش کہ دار میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ جو ایک نظر اس پر ڈالتا تھا اسی کا ہو رہتا تھا۔

دیوبند کے اثرات ملک کے اداروں اور شخصیات ہی پر نہیں بیرون کی اکابر شخصیات پر بھی پڑے اور ادارے بھی ان سے متاثر ہوئے۔ سفرنامہ اسیر مالٹا، نقش حیات، تحریک شیخ الہندؒ، ریشمی رومال تحریک، مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریرات، اقبال شیدائی کی سرگزشت، ظفر حسن کی آپ بیتی وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی ملی و سیاسی تحریک سے افغانستان، ترکی اور حجاز کی متعدد اہم شخصیات متاثر تھیں ——

—— دارالعلوم دیوبند کے اثرات بعض مستقل علمی خانوادوں پر بھی پڑے اس سلسلے میں پنجاب کے غزنوی خاندان اور یوپی کے بعض اہل حدیث علماء کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ علمائے اہل حدیث خصوصاً غزنوی خاندان اپنی ایک مستقل علمی روایت رکھتا ہے اس کی فکر و خدمات کا پیمانہ بہت بلند ہے۔ وہ دین اور ملت کی خدمت گزاری کی عظیم الشان تاریخ میں اپنا امتیاز رکھتا ہے۔ اس طرح لدھیانہ کا خانوادہ علمی جس کے آخری دور کے ورثاء علم و عمل میں مفتی محمد نعیم اور مولانا حبیب الرحمٰن کے سے اصحاب عزیمت و دعوت گزرے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جو ایک مستقل حیثیت کے مالک ہیں وہ اپنی زندگی اور افکار کی تعمیر میں اپنے والد کی فکری و علمی شخصیت کے بھی رہین منت نہیں ہیں۔ بلاشبہ انہوں نے اپنے والد کی سیرت کے کچھ اجلے نقوش کو اپنا لیا تھا، لیکن دارالعلوم دیوبند

اور اکابر دیوبند کی عظمت اور حضرت شیخ الہندؒ کی سیرت سے بھی متاثر تھے ۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی۔ انہیں ندوۃ العلماء کا فرزند عظیم کہنا چاہئے ، لیکن دارالعلوم دیوبند کے دائرہ اثر سے وہ بھی باہر نہ رہے ۔ وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سلسلۂ بیعت میں منسلک اور مجاز بیعت وارشاد تھے ۔ یہ مولانا تھانویؒ کا فیضان نظر کہئے یا مکتب دیوبند کی کرامت کہ اس تعلق بیعت کے بعد ان کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوا معراج روحانی کے اثبات میں ان کے پاس عقل ومنطق کے استدلات کی کمی نہ تھی ۔ وہ روایات کا سہارا لے سکتے تھے ۔ بعض صحابہؓ اور علماء وحکماء کے اختلافات سے اپنے مقدمہ کو مستحکم کر سکتے تھے ۔ لیکن ان کی روح سعید وقلب سلیم نے کمزور بنیادوں پر افکار کی تعمیر گوارا نہ کی اور اسی مسلک کو اختیار کیا جو دیوبند کے علمائے حق کا مسلک تھا اور مولانا تھانوی کے فیضان فکر ونظر نے جس کیطرف رہنمائی کی تھی ۔

اسی سلسلے میں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کا نام بھی آتا ہے ۔ ان کی عقیدتوں اور ارادتوں کے رشتے اکابر دیوبند سے ہمیشہ استوار رہے ۔ موجودہ شخصیتوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نامور شخصیت ہے ۔ ان کا تعلق رائے بریلی کے اس خانوادۂ علم وعرفان سے ہے جس کے ارادت مندوں اور فیض یافتگان نے دارالعلوم دیوبند کی بناد تعمیر میں حصہ لیا تھا ۔ ان کے خاندان میں علم ودین کی ایک خاص روایت رہی ہے ۔ وہ خود دعوت وارشاد کے سلسلے کی ایک اہم شخصیت ہیں ۔ ان کے خاندان میں علم ودین سیرت واخلاق اور عرفان وتصوف کا کون سا سرمایہ نہ تھا جس کے لئے وہ دوسروں کے محتاج ہوتے ۔ لیکن علمائے دیوبند سے ان کی عقیدت وارادت معلوم ہے اور علوم قرآنی میں حضرت شیخ الہندؒ کے جانشین حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی تعلیم وتربیت اور سیرت کی جھلک آنمحترم کی فکر وسیرت میں دیکھی جا سکتی ہے ۔

علمی خدمات | علمی خدمات کے میدان میں بھی دیوبند اور اس کے فرزندوں نے کام ہی نہیں کیا کارنامے انجام دئے ہیں ۔ یہ علمی خدمات شخصی طور پر بھی انجام دی گئی ہیں اور منظم علمی اداروں کی صورت میں بھی دارالعلوم دیوبند نے بلند پایہ اہل قلم ، مصنف ، شاعر ، صحافی اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین پیدا کئے ۔

مفسرین ومترجمین قرآن کے سلسلے میں سب سے پہلا نام حضرت شیخ الہندؒ کا آتا ہے ۔ آپ کے شاگردوں میں کئی حضرات ایسے گذرے ہیں جن کا شمار بلند پایہ مفسرین میں ہوتا ہے ۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا عبیداللہ سندھی ، مولانا اشرف علی تھانوی ، مولانا احمد علی لاہوری ، اور بواسطہ اشرف علی تھانوی ، مولانا عبدالماجد دریا بادی کا شمار بھی اسی مکتبۂ فکر کے مفسرین میں کیا جانا چاہئے ۔

یہ تمام مفسرین اپنی تفسیری خصوصیات کی بنا پر مفسرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں ۔ مولانا سندھی اور حضرت تھانویؒ تو گویا مستقل تفسیری دبستان کے بانی ہوئے ہیں ۔

عام اہل قلم میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ وغیرہ ایسے اصحاب علم و اہل قلم ہیں جنہوں نے اپنے افکار اور تحقیقات سے اردو کے دینی و تاریخی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ صحافیوں میں مولانا شائق احمد عثمانی (ایڈیٹر عصر جدید۔ کلکتہ) اور مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر الجمعیۃ دہلی) اور شاعروں کی صف میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے سے نامور صحافی اور شاعر گزرے ہیں۔ لاہور کے زمانہ قیام میں مولانا تاجور نجیب آبادی کی معرکہ آرائیاں تاریخ ادب اردو کا نہایت دلچسپ باب ہیں۔ مصلحین امت میں مولانا احمد علی لاہوریؒ، اور مولانا اشرف علی تھانویؒ محققین و مفکرین اور محافظین ناموس رسالت میں مولانا انور شاہ کاشمیری علیہ الرحمہ کی سی نابغہ روزگار شخصیات گزری ہیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحومین اور ملک کے نامور خطیب ہوئے ہیں۔ قاری محمد طیب صاحب کا شمار بھی پاک و ہند کے بلند پایہ خطیبوں میں ہوتا ہے۔

علمی و مجلاتی صحافت کے میدان میں تو دیوبند کی خدمات کا پیمانہ بہت ہی بلند رہا ہے الرشید، القاسم، دارالعلوم وغیرہ رسائل تو دیوبند سے جاری ہوئے اس کے فرزندوں نے ملک کے طول و عرض میں اردو، عربی وغیرہ کے جو رسائل نکالے ان کی فہرست مرتب کرنے کیطرف ابھی شاید کسی نے توجہ نہیں کی۔ دیوبند کی خدمات کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ رسائل و جرائد کے ذریعے وقت کے اہم دینی، معاشی، سیاسی مسائل پر نہایت بلند پایہ لٹریچر فراہم ہوا۔ بلند پایہ علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات لکھے گئے، تہذیب و ثقافت اور دور جدید کے بے شمار مسائل پر فکر انگیز مضامین کا ذخیرہ فراہم ہوا۔

آج بھی ہندوستان پاکستان میں اگر بلند ترین علمی و تحقیقی اور دینی مجلات کی ایک مختصر فہرست تیار کی جائے تو سر فہرست نام برہان دہلی، الحق اکوڑہ خٹک، اور بینات والبلاغ کراچی ہوں گے۔

علمی و تحقیقی اداروں کا قیام دارالعلوم دیوبند میں اور اس کے باہر اس کے فرزندوں نے حالات وقت کے مطابق بلند پایہ علمی و تحقیقی ادارے بھی قائم کئے اور اب تو تقریباً تمام دینی مدارس میں تحقیق اور تصنیف و تالیف اور مجلات کے مستقل شعبے قائم ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بے شمار اور اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے فارغ التحصیل ایسی ذہنی و فکری تربیت سے آراستہ ہوتے ہیں۔ جو کسی راہ میں صرف مقلدانہ گام فرسائی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ حالات و وقت کے مطابق اپنی راہ آپ پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حالات و وقت کا جون جون تقاضا ہوا علمی ادارے بھی قائم ہوتے گئے اور رسائل و جرائد کا اجرا بھی عمل میں آتا گیا اور اس کے فرزند علم و عمل کے مختلف میدانوں میں ملت کی خدمت کی راہیں خود تلاش کرتے گئے۔ دارالعلوم کے اندر تصنیف و تالیف کے شعبہ

کے علاوہ کئی اکیڈمیاں قائم ہیں۔ ان میں سے ایک "مجلس معارف القرآن" ہے۔ دارالعلوم سے باہر ندوۃ المصنفین (دہلی) دارالعلوم کے فرزندوں کا کارنامہ ہے۔ مجلس علمی (ڈابھیل حال کراچی) اسی سلسلے کے تحقیق اور تصنیف و تالیف کا ذوق رکھنے والوں نے قائم کی انجمن خدام الدین اپنے تمام شعبوں کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کے عظیم شاگرد مولانا احمد علی لاہوری کے دینی وملی خدمت گزاری کے جذبات کی آئینہ دار ہے۔ بیت الحکمت کے نام سے مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کا مرکز دہلی اور اسکی شاخیں کراچی، پیر جھنڈا، خان پور، لاہور میں قائم کیں۔ ان کے تحت بعض اہم تصانیف شائع ہوئیں۔ ان کے علاوہ تبلیغی واشاعتی ادارے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔

بحیثیت مجموعی علوم ومعارف دینی میں تو دارالعلوم کو خاص امتیاز حاصل ہی تھا۔ دیگر علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں بھی انہوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ قرآن کے متعلق مختلف علوم میں، حدیث کے مختلف میدانوں میں، فقہ میں، علوم نقلیہ وغیرہ علوم دینی میں مقلدانہ اور نقل و اقتباس کی خصوصیات ہی کی بنا پر نہیں بلکہ مجتہدانہ نظر وبصیرت کی بنا پر بھی ان کے امتیاز و اختصاص کو دینی وعلمی حلقوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ امتیاز دیوبند کی تاریخ ماضی ہی کا نہیں بلکہ آج تک اس کا یہ امتیاز قائم ہے۔

سیاسی خدمات اکابر دارالعلوم نے ہمیشہ اور ہر دور میں مسلمانوں کی فلاح وبہبود، ملت کے قیام ملک کی آزادی اور ترقی کی ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور خواہ مسلمانوں کے مصالح ہوں یا تمام برادران کے مشترکہ مفاد کی جدوجہد ہو، انہوں نے کبھی ملت کی بہی خواہی اور خدمت خلق کے کاموں میں اپنے آپ کو کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں وہ کسی دوسری جماعت کے نہ مقلد تھے نہ پیرو۔ تحریک اصلاح و جہاد کے زمانے سے ان کے بزرگوں نے قیام ملت اور ملک اور تمام برادران وطن کی آزادی اور فلاح وبہبود کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا تھا وہ اسی کی طرف بڑھ رہے تھے اس میں اپنوں اور بیگانوں سے اختلاف واتحاد کے مرحلے پیش آتے رہے لیکن انہوں نے نہ کسی پر بھروسہ کیا نہ کسی کا انتظار وہ تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتے رہے۔ ہندوستان پاکستان کی جنگ آزادی کے ابتدائی دور سے لے کر آج تک ان کے سامنے تحریک خلافت تحریک ترک موالات، تحریک جہاد، تحریک ہجرت، تحریک پاکستان اور تقسیم ملک کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے اوقاف، تاریخ وثقافت کے آثار، تعلیم، اردو اور مسئلہ زبان مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی اور ان کے حقوق کی جدوجہد کے بے شمار مسائل پیدا ہوئے۔ پاکستان میں تحریک ختم نبوت اور جمہوریت کے قیام اور اسلامی دستور کے نفاذ کی تحریکات نیز مسلمانوں کی اصلاح، تہذیب اخلاق، اشاعت تعلیم، وغیرہ تحریکات تھیں ان میں دارالعلوم کے فرزندوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور حالات و وقت کے مطابق ان تمام تحریکات ومسائل میں دین کی تعلیمات

حقہ کے مطابق مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) جمعیۃ الانصار دیوبند اور ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علمائے ہند کے آغاز کے قیام سے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں منظم طور پر حصہ لیا۔ اکابر کی ایک جماعت نے جمعیۃ علمائے اسلام کے قیام سے ایک دوسرے انداز سے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور تحریک پاکستان کو تقویت دی۔ آزادی کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔ قید وبند کی سختیاں جھیلیں، مال ومتاع کا نقصان برداشت کیا۔ تجارت وملازمت کو اس راستے میں قربان کر دیا اور اس جماعت کے ایک ایک فرد نے اتنی قید وبند اور اتنا نقصان برداشت کیا کہ مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں نے مجموعی طور پر بھی نہ اتنی قید کاٹی ہوگی نہ اتنا نقصان برداشت کیا ہوگا۔ صرف ایک شخص مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے چوبیس سال جلاوطنی کی زندگی کے مصائب برداشت کئے۔ دارالعلوم دیوبند نے اپنے وابستگان سے مجاہدین حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کر دی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس جماعت میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ہیں، اسی جماعت میں حضرت شیخ الہندؒ کی ذات والا صفات نظر آتی ہے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ ہیں۔ جان نثار اسلام مولانا عزیر گل ہیں۔ امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی ہیں، فقیہ امت حضرت مولانا مفتی اعظم کفایت اللہ ہیں، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد میاں منصور انصاری ہیں۔ عازم حق مولانا محمد صادق (کراچی) ہیں، اس زنجیر کی آخری کڑیاں بھی ابتدائی کڑیوں سے کچھ کم اہم اور کم شاندار نہ تھیں۔ ان میں سے ایک کڑی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی سیرت میں ڈھل کر ہمیشہ کیلئے تابندہ وزندہ جاوید ہوگئی تھی۔ حضرت سیوہاروی کی ذات ستودہ صفات بارش کا آخری قطرہ تھا جو ملت کے نخل امید کو تر وتازہ کر گیا۔ انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو خدمت کی اور ان کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لئے جو مجاہدانہ کردار ادا کیا وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اگر اس کے بعد بھی ملت مسلمہ کا وجود باقی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت موجود ہے۔ تو ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ دارالعلوم کے اخلاف میں بھی ایسی نابغہ اور صاحب عزیمت شخصیتیں ضرور پیدا ہوں گی جو ملت کی کشتی کو بھنور سے نکالیں گی اور اس کے مسافر ساحل امید کو پالیں گے۔

ادبی ولسانی خدمات | اردو زبان کے باب میں بھی اکابر دیوبند کی خدمت کا پیمانہ نہایت بلند رہا اردو کو آسان بنانے، بول چال کی زبان سے اسے ہم آہنگ کرنے اور ایک علمی زبان کا رتبہ دینے میں سرسید کی خدمات کا صور کچھ اس بلند آہنگی سے پھونکا گیا ہے۔ کہ لوگ یہی سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک کے قافلہ سالار سرسید ہیں لیکن ان بے خبروں کو معلوم نہیں کہ تاریخ کی شہادت اس سے مختلف ہے۔ سرسید کی پیدائش کا سال ۱۸۱۷ء ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کا سال وفات بھی یہی ہے۔ شاہ عبدالقادر کا انتقال اس سے تین سال قبل یعنی ۱۸۱۴ء میں ہو چکا تھا ان ہر دو ابنائے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فرد خدمات میں ترجمۂ قرآن بہت نمایاں ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی اولیت اور حضرت شاہ عبدالقادر کے ترجمے کی سلاست اور بامحاورہ و

ٹکسالی زبان میں ہونے کی شہادت سرسیّد نے خود دی ہے اور بابائے اردو مولوی عبدالحق تک اردو کے تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے ترجمے کے ادبی و لسانی محاسن کا اعتراف کیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ حضرات تھے جن کی خدمات کو دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے زمرے میں محسوب نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ وہ اسلاف تھے جن کی وراثت علمی و دینی کا وارث اوّل اگر کوئی ہے تو وہ دارالعلوم دیوبند ہے۔ ان اصحاب کے بعد مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا دور آتا ہے۔ یہ زمانہ سرسیّد کی خوردسالی کا تھا۔ ان حضرات کی خدمات کا غلغلہ بلند تھا۔ اور دہلی کی ٹکسالی اور بامحاورہ اردو میں ان کی عظیم الشان کتاب "تقویت الایمان" منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ سرسیّد نے حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے مطالب سے اپنے دامن فکر و نظر کو بھرا تھا۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب بھی بانیانِ دارالعلوم میں نہ تھے لیکن اس بزرگ وقت کی میراث فکر و سیرت تو اکابرِ دیوبند ہی کے حصّے میں آئی نہ کہ سرسیّد اس کے وارث ہوئے۔ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، قطب وقت حضرۃ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ تو دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ حضرات اس وقت بامحاورہ، بول چال کی زبان اور آسان و عام فہم اردو میں اپنی متعدد کتب و تصانیف تالیف فرما چکے تھے جب بانی علی گڑھ کالج سرسیّد احمد خان، صہبائی مرحوم سے مقفیٰ مسجع زبان لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ حضرۃ قاسم نانوتویؒ کی تالیف رسالہ حجۃ الاسلام، تقریر دلپذیر مجموعہ رسائل قاسم العلوم وغیرہ حضرت امداد اللہ کی تصانیف غذائے روح، ضیاء القلوب، تحفۃ العشاق، فیصلہ ہفت مسائل اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی تصانیف کا تعلق خاص سرسیّد کے عہد سے تھا۔ یہ حضرات بانیان دارالعلوم تھے۔ ان تصانیف کے ادبی محاسن اور لسانی خصائص کی طرف کم توجہ کی گئی ہے، لیکن ان کا دائرہ اس سے بہت وسیع ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے ان کی ادبی اور لسانی خدمات کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب سرسیّد کتمان عدم سے وجود میں بھی نہ آئے تھے، انکی خدمات کا یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب ان کے دودھ کے دانت بھی نہ اکھڑے تھے۔ وہ یہ خدمت اس وقت بھی اپنے قلم سے انجام دے رہے تھے جب سرسیّد اپنی تحریر و تالیف میں صہبائی کی نظر و کاوش کے رہین منت تھے اور یہ خدمت انہوں نے اس وقت بھی انجام دی جب سرسیّد انگریزی حکومت کی برکتیں اور برٹش حکومت کے قیام اور استحکام کے لئے "اپنی مدد آپ" قسم کے مضامین لکھ رہے تھے۔ اور دیوبند کی یہ خدمت اس وقت بھی جاری رہی جب اردو ادب کے عناصر خمسہ میں اختلال پیدا ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ منتشر ہوگئے۔ سرسیّد اس جہاں سے رخصت ہوگئے اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہ ہوسکا۔ نذیر احمد، شبلی، محمد حسین آزاد، دوسرے دائروں سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے سرسیّد کی تحریک کیطرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ حالی بلاشبہ اپنی وفاداری میں استوار رہے لیکن ان کے جانشینوں نے ادب میں اپنی راہ آپ بنائی۔ بہرحال سرسیّد نے زبان و ادب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اس سے انکار نہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ اولیّت کا سہرا اس میدان میں بھی اربابِ دیوبند کے سر ہے۔ ■■